Research Journal Ulum-e-Islamia
Journal Home Page: https://journals.iub.edu.pk/index.php/Ulum-e-Islamia/
E-Mail:muloomi@iub.edu.pk ISSN: 2073-5146(Print) ISSN: 2710-5393(Online)
Vol.No: 31, Issue:02. (Jul-Dec 2024) Date of Publication: 27-11-2024
Published by: Department of Islamic Studies, The Islamia University of Bahawalpur

مسیحی الٰہیات کی تفہیم اور تعبیرات جدیدہ میں مقدس پولس کا کردار: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

The Roll of Saint Paul in the Understanding and Contemporary Interpretations of Christians Theology: A Critical and Analytical Study

Suleman Khalil
E-Learning Programs Coordinator, Seeraht Institue & Research Center, Faisalabad.
Corresponding Author Email: rsulemankhalil@gmail.com
Samia Faisal
MPhil Islamic Studies, Riphah International University, Faisalabad

Abstract:
Saint Paul holds a pivotal role in shaping Christian theology, particularly in developing the concept of original sin. This doctrine, absent from Christ's teachings and Old Testament scripture, posits that humanity inherited sinfulness from Adam and Eve's disobedience in the Garden of Eden. Paul linked this inherited sin to the necessity of salvation through Jesus Christ, framing Christ's crucifixion as a redemptive sacrifice for humanity's sins. Paul's interpretation was influenced by Greek philosophical traditions and ancient cultural practices, including sacrificial rituals where a leader's beloved was offered to appease divine forces. This concept diverges from Old Testament teachings, which emphasize personal accountability, stating, the son shall not bear the guilt of the father. Critically, Paul's theology faced significant debate within the church. Figures like Saint Augustine endorsed original sin, asserting its universal influence, while others, such as Pelagius, contended that humans are born morally neutral, with the choice of good or evil determined by free will. These disputes highlight the constructed nature of Paul's doctrine, which gained traction during the Reformation when Martin Luther and others reaffirmed Augustine's interpretations. Contemporary perspectives challenge Paul's framework, questioning its logical and theological validity. If Christ's sacrifice eradicated sin, why does evil persist? Critics argue that Paul's theory burdens humanity with inherited guilt, a concept incompatible with a just and merciful God. Thus, Paul's role in Christian theology remains both foundational and controversial this has been made the subject of discussion in this paper.

Keywords: Christianity, Christians Theology, Christians Beliefs, Interpretations

تعارف:

پولس، جس کا اصل نام شاؤل تھا، پہلی صدی عیسوی میں کلکِیہ کے شہر ترسس میں پیدا ہوا۔[1] جو آج کے دور کے ترکی کے جنوب مشرقی حصے میں واقع ہے۔ وہ بنیمین کے قبیلے اور عبرانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ فلپیوں کو لکھے گئے اپنے خط میں پولس نے اپنی شناخت بیان کرتے ہوئے کہا کہ میرا آٹھویں دن ختنہ ہوا، میں اسرائیلی ہوں اور بنیمین کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں، ایک خالص عبرانی ہوں اور میرے والدین بھی عبرانی ہیں۔ شریعت پر عمل کے معاملے میں، میں فریسی تھا۔[2]

پولس کے والدین فریسی تھے، جو موسوی شریعت کی سختی سے پابندی کرنے والے اور اپنے بچوں کو غیر یہودی اثرات سے بچانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اُن کے گھرانے میں یونانی چیزوں کو ناپسند کیا جاتا تھا، تاہم پولس کو یونانی اور محدود حد تک لاطینی زبان پر عبور حاصل تھا۔ گھر میں عام طور پر ارامی زبان بولی جاتی تھی، جو عبرانی سے مشابہ تھی اور یہودیہ میں بولی جاتی تھی۔ اگرچہ ان کا خاندان رومی شہریت رکھتا تھا، لیکن وہ یروشلیم کو ایک پاک اور مقدس شہر کے طور پر دیکھتے تھے۔[3]

تیرہ سال کی عمر میں پولس کو گملی ایل نامی ایک مشہور ربّی کے زیرِ تربیت یہودیہ بھیجا گیا، جہاں اس نے یہودی تاریخ، زبور، اور نبیوں کے صحائف کی تعلیم حاصل کی۔ اس کی تعلیم پانچ سے چھ سال تک جاری رہی، جس دوران اُس نے کلام مقدس کی تفہیم و تحقیق اور شریعت کی تشریح کے اصول سیکھے۔[4] اس دوران اُس نے بحث و مباحثے کے اُس انداز میں مہارت حاصل کی جسے قدیم زمانے میں "Diatribe" کہا جاتا تھا، جس کا مقصد شریعت کے مخالفین پر سخت تنقید کرنا اور اُن کے دلائل کو رد کرنا تھا۔

اس تربیت کے نتیجے میں شاؤل نے شریعت کے اصولوں میں بھی مہارت حاصل کی اور ممکنہ طور پر وہ سین ہیڈرن (یہودی صدرِ عدالت) کے رکن بننے کے بہت قریب تھا، جو 71 اراکین پر مشتمل یہودی مذہبی و معاشرتی معاملات کا اعلیٰ ترین ادارہ تھا۔ پولس اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں شدید جذبہ رکھتا تھا، جو اُسے کسی قسم کے سمجھوتے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہی جوش و خروش اُس کی مذہبی انتہاپسندی کی طرف جھکاؤ کا سبب بنا۔

اعمال کی کتاب کے مطابق، پطرس نے سین ہیڈرن کے سامنے حضرت عیسیٰؑ اور انجیل کا دفاع کیا۔ پولس بھی اس موقع پر موجود تھا۔ اُس وقت گملی ایل نے مجمع کو پطرس کو سنگسار کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی۔ پولس ستفنس کے مقدمے کے دوران بھی موجود تھا اور اُس کی سنگساری کے وقت بھی وہاں موجود ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اُس موقع پر سنگسار کرنے والوں نے اپنے کپڑے پولس کے پاس رکھے تھے۔[5]

ستفنس کی موت کے بعد یروشلیم کی کلیسیا پر شدید ظلم و ستم برپا ہوا۔[6] پولس، جو مسیحیوں کے خلاف سخت اقدامات کرنے پر تُلا ہوا تھا، اپنی کوششوں میں بے رحم اور پُرعزم تھا۔ اُس کا ماننا تھا کہ وہ خدا کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ مذہبی انتہاپسندی سے متاثرہ پولس ایک ایسا شخص تھا جو خدا کی مرضی سمجھ کر بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اعمال کی کتاب میں پولس خود بیان کرتا ہے کہ میں کلیسیا کو تباہ کرنے کے لیے گھر گھر گھس کر مردوں اور عورتوں کو گھسیٹ کر قید میں ڈالتا تھا۔[7]

پولس نے دمشق کا سفر کیا، جو تقریباً 150 میل کے فاصلے پر تھا۔ اس سفر کا مقصد مسیحیوں کو گرفتار کر کے یروشلیم واپس لانا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے سردار کاہن سے دمشق کے عبادت خانوں کے لیے خطوط طلب کیے تاکہ وہ مسیحیوں کو قید کر سکے۔

سفر کے دوران، اچانک آسمان سے ایک نور چمکا اور پولس زمین پر گر پڑا۔ اُس نے ایک آواز سنی، اے شاؤل، اے شاؤل! تُو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ شاؤل نے پوچھا، اے خداوند! تُو کون ہے؟ جواب آیا، میں یسوع ہوں جسے تُو ستاتا ہے۔[8]

کچھ مسیحی علماء کا ماننا ہے کہ یہ یسوع سے پولس کی پہلی ملاقات نہیں تھی اور ممکن ہے کہ پولس یسوع کی موت کے وقت بھی وہاں موجود ہو۔ تاہم، اس واقعے نے اُس کی زندگی ہمیشہ کے لیے بدل دی۔ یہ مکاشفہ پولس کی آنکھوں کی بینائی چھین لینے کا باعث بنا، جس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مکاشفہ کے مطابق، پولس کو دمشق پہنچنا تھا جہاں حننیاہ نامی شخص سے اُس کی ملاقات ہونا تھی۔ حننیاہ ابتدائی طور پر پولس سے ملنے میں ہچکچایا کیونکہ وہ اُس کی شہرت سے واقف تھا۔ تاہم، خداوند نے حننیاہ کو ہدایت دی کہ پولس اُس کا چُنا ہوا وسیلہ ہے جو غیر قوموں، بادشاہوں اور بنی اسرائیل کے سامنے اُس کا نام ظاہر کرے گا[9] اور اس راہ میں بہت دُکھ سہے گا۔[10] حننیاہ نے پولس کے پاس جا کر اُس پر ہاتھ رکھا، دعا کی، اور پولس کو روح القدس ملا۔[11] اُس کی بینائی بحال ہو گئی اور اُس نے بپتسمہ لیا۔[12]

اپنی تبدیلی کے بعد پولس فوراً عبادت خانوں میں یسوع کی الوہیت اور اُن کے مسیح ہونے کی منادی کرنے لگا۔[13] اُس کی اس تبدیلی نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا کیونکہ وہ اُسے مسیحیوں کا سخت مخالف جانتے تھے۔ یہودی، جو اُسے مسیحیوں کو قید کرنے والا سمجھتے تھے[14] اُس کی تبلیغ

سے پریشان ہو گئے۔ لیکن پولس کی دلیری اور استقامت بڑھتی چلی گئی۔ دمشق میں اُس کی تبلیغ سے لوگ حیران رہ گئے، اور اُس کے دلائل نے یہودیوں کو الجھن میں ڈال دیا۔[15]

اپنی تبدیلی کے کچھ ہی عرصے بعد پولس عرب چلا گیا، جس کا ذکر اُس نے گلتیوں کے خط میں کیا ہے۔[16] یہ واضح نہیں کہ وہ کتنے عرصے بعد واپس آیا، لیکن جب وہ دمشق لوٹا تو اُس نے مزید پرجوش ہو کر تبلیغ شروع کی، جس کی وجہ سے یہودیوں نے اُسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے دشمنوں کے ارادے جان کر پولس کے شاگردوں نے اُس کی جان بچانے کے لیے اُسے ٹوکری میں بٹھا کر دیوار کے راستے شہر سے باہر بھیجا۔[17]

اپنے مسیحی ایمان لانے کے تین سال بعد، پولس یروشلیم واپس آیا تاکہ پطرس سے ملاقات کرے اور تعلقات مضبوط کرے۔[18] تاہم، یروشلیم کی کلیسیا کے بزرگوں نے ابتدائی طور پر اُس پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ اُس کے ماضی سے واقف تھے۔ مگر برنباس کی وساطت سے اُن کا شک ختم ہوا، اور انہوں نے پولس کو اپنی رفاقت میں قبول کیا۔ اِس کے بعد پولس اُن کے ساتھ دلیری سے یروشلیم میں گھومتا رہا اور یسوع کے نام کی گواہی دیتا رہا۔[19]

پولس کی یونانی نژاد یہودیوں کے درمیان تبلیغ نے شدید مخالفت کو جنم دیا، جس کے باعث اُسے محض پندرہ دن کے اندر یروشلیم چھوڑنا پڑا۔ مسیح نے ایک رویا میں اُسے ہدایت دی، اور شاگردوں کے مشورے سے وہ ترسس جانے پر راضی ہو گیا۔ پولس نے ترسس میں کئی سال گمنامی میں گزارے۔

المختصر پولس نے اپنی ابتدائی زندگی کا زیادہ تر وقت عرب، دمشق، یروشلیم، سوریہ اور کلِکِیہ (اپنے آبائی علاقے) میں گزارا۔ برنباس نے انطاکیہ کی کلیسیا میں پولس کو شامل کیا تاکہ وہ وہاں تعلیم دے سکے۔[20] دلچسپ بات یہ ہے کہ انطاکیہ کی کلیسیا کی بنیاد اُن مسیحیوں نے رکھی تھی جو ستفنس کی موت کے بعد ہونے والے ظلم و ستم کے باعث یہودیہ سے نکلے تھے۔[21] پولس کا پہلا مشنری سفر 40ء کے اختتام پر شروع ہوا۔ چونکہ اُس نے زیادہ وقت غیر قوموں کے علاقوں میں گزارا، اُس نے اپنا رومی نام پولس اختیار کر لیا، جس سے وہ مشہور ہوا۔[22]

پولس نے نئے عہد نامے کی تیرہ کتب قلمبند کیں، جنہیں اُس کے الہامی نظریات اور تعلیمات کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ تحریریں پولس کی مذہبی سوچ اور مسیحی عقائد کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

پولس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ روم کے مختلف علاقوں میں یسوع مسیح کے جی اُٹھنے کی خوشخبری سنانے میں گزارا۔ اِس دوران اُسے کئی خطرات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔[23] آخر کار، 66ء کے آخر یا 67ء کے شروع میں پولس کو قتل کر دیا گیا۔ اُس کا سر روم کے قریب اوستیہ کی سڑک پر قلم کیا گیا، جو روم سے اوستیہ کی بندرگاہ کو جاتی تھی۔[24]

مسیحیت میں نجات، کفارہ، اور شریعت کا تصور

عیسائی مفکرین کے مطابق، خدا عادل اور مقدس ہے اور اس کی صفات کا تقاضا ہے کہ وہ گناہوں کو بغیر سزا یا فدیہ کے معاف نہیں کر سکتا۔ تاہم اپنی صفتِ رحمت کے تحت وہ گناہوں کی معافی بھی عطا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ خدا نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں اُس کا انصاف اور تقدس متاثر نہ ہو۔ اسی مقصد کے تحت یسوع مسیح کو بطور شفیع (Mediator) مقرر کیا گیا تاکہ انسانیت کو نجات فراہم کی جاسکے۔ اس نظریے کے تحت عیسائیت میں یہ تصور پیدا ہوا کہ خدا اپنے اختیار سے گناہ معاف کرنے کے قابل نہیں، جو درحقیقت اُس کی قادرِ مطلق ہونے کی صفت کی نفی کرتا ہے۔[25]

عہدِ عتیق میں نجات کا تصور

پرانے عہد نامہ میں نجات کا تصور ایمان، عمل، اور خدا کی فرمانبرداری پر مبنی تھا۔ قاموس الکتاب کے مصنف لکھتے ہیں کہ عہد عتیق میں نجات حاصل کرنے کے لیے انسان پر سب سے اہم شرط خدا پر مکمل بھروسا تھا۔ اس کے ساتھ ہی، خدا کی اخلاقی شریعت کی پیروی اور فرمانبرداری بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ تاہم، گناہوں کی معافی کے لیے صرف رسمی عبادات کافی نہ سمجھی جاتیں بلکہ توبہ بنیادی شرط تھی۔ کئی مواقع پر

قربانیاں بھی توبہ کے عمل کا حصہ ہوتی تھیں۔[26]

عہدِ عتیق کے مطابق نجات ایمان اور اعمال کا مجموعہ تھی۔ اگر اعمال میں کوتاہی ہو جاتی تو کفارے کے لیے قربانیوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ انبیائے کرام نے اپنی تعلیمات میں توبہ اور ندامت کو بنیادی حیثیت دی اور واضح کیا کہ رسمی عبادات یا قربانیاں اس وقت تک مؤثر نہیں جب تک انسان دل سے توبہ نہ کرے۔[27] دلچسپ بات یہ ہے کہ عہدِ عتیق میں کفارہ کا کوئی واضح یا مکمل نظریہ موجود نہیں ہے۔[28]

عہدِ نامہ جدید میں کفارے کا تصور

نئے عہد نامہ کے مطابق، مسیح کی صلیب کو کفارہ گاہ قرار دیا گیا، جہاں کامل قربانی دی گئی اور خون بہایا گیا۔ اس قربانی کو تمام انسانیت کے لیے موثر سمجھا گیا۔ اس حوالے سے مسیحیت کا عقیدہ ہے کہ یسوع کی صلیب پر قربانی نے تمام گناہوں کو ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا۔[29] نئے عہد نامہ میں فدیہ (Redemption) کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب قاموس الکتاب نے لکھا ہے کہ فدیہ سے مراد وہ قیمت ہے جو یسوع نے اپنے ماننے والوں کی نجات کے لیے صلیب پر ادا کی۔[30] پولس نے اپنے خطوط میں اس نظریے کو واضح کیا اور شریعت کی منسوخی کا اعلان کیا۔[31] جس نے عیسائیت میں نجات کے تصور کو ایک نئی شکل دی۔

حضرت مسیح کی تعلیمات میں نجات کا تصور

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں ایمان اور توبہ کو نجات اور معافی کے لیے کافی قرار دیا گیا۔ ایک تمثیل میں مسیح فرماتے ہیں کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ ننانوے راست بازوں کی نسبت، جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے، ایک توبہ کرنے والے گناہگار پر آسمان پر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔[32] ایک اور تمثیل میں توبہ کرنے والے گناہگار کو مردہ سے زندہ ہونے کے مترادف قرار دیا گیا۔[33]

اسی طرح، حضرت مسیح نے نیک اعمال پر زور دیتے ہوئے کہا کہ انسان کو خدا کے تمام احکامات کی پیروی کرنی چاہیے اور اپنے اعمال کو کم جاننا چاہیے۔[34] وہ فرماتے ہیں کہ جس کے پاس میرے حکم ہیں اور وہ ان پر عمل کرتا ہے، وہی مجھ سے محبت رکھتا ہے۔[35]

ایک شخص نے مسیح سے نجات کا اصول دریافت کیا تو آپ نے فرمایا، اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر۔[36] جرمن مسیحی اسکالر کے مطابق، مسیح نے اپنی ذات کے متعلق کسی خاص عقیدت یا اعتقاد کی خواہش نہیں رکھی، بلکہ وہ لوگوں کو احکام کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔[37]

پولس کا ابتدائی نظریہ

مسیحیت قبول کرنے کے ابتدائی دور میں پولس کا نظریہ بھی یہ تھا کہ نجات کے لیے ایمان اور اعمال ضروری ہیں۔ چنانچہ اُس نے بادشاہ کے سامنے گواہی دی کہ میں سارے ملک یہودیہ اور غیر قوموں کو یہ سکھاتا تھا کہ وہ توبہ کریں اور خدا کی طرف رجوع کر کے توبہ کے موافق کام کریں۔[38]

ابتدائی کلیسیا کا نظریہ

ابتدائی کلیسیا کے رہنما مسیح کے بھائی یعقوب نے شریعت پر عمل کو نجات کا لازمی حصہ قرار دیا کہ جس نے ساری شریعت پر عمل کیا اور ایک ہی بات میں خطا کی، وہ سب باتوں میں قصوروار ٹھہرا۔ ایمان بغیر اعمال کے مردہ ہے۔ یعقوب نے ابراہیم کی قربانی کو نجات کے اصول کا نمونہ قرار دیا اور اعمال کو ایمان کا تکمیل کرنے والا عنصر قرار دیا۔[39]

پولس اور شریعت کی منسوخی

بعد ازاں خود پولس نے یعقوب اور دوسرے حواریوں کے ساتھ مشورے کے تحت شریعت کی پابندی کا اعلان کیا تاکہ شریعت کی اہمیت کو مسیحیوں کے سامنے واضح کیا جاسکے۔[40] تاہم، پولس کے نظریات میں وقت کے ساتھ تبدیلی آئی، اور اُس نے نجات کو محض ایمان اور مسیح کے کفارے سے مشروط قرار دیا، جس سے عیسائیت میں شریعت کی پیروی کی روایت کمزور پڑ گئی۔

کفارہ کا تصور

مسیح کے حواری اور ابتدائی مسیحی کا ماننا تھا کہ نجات کا راستہ شریعت کی پیروی اور گناہوں کی تلافی کے لیے توبہ کے ذریعے ممکن ہے۔ کفارہ کا عقیدہ بعد میں متعارف ہوا۔ ابتدائی کلیسیائی رہنما مسیح کی قربانی کو الٰہی غضب کو ختم کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے[41]، اور نئے عہد نامہ میں بھی اس عقیدے کا کوئی بنیادی کردار نہیں ہے۔[42]

عقیدہ کفارہ کی بنیاد

پولس نے اس نظریے کو متعارف کرایا کہ انسان گناہ کے ازلی لعنت کے زیر اثر ہیں، جس کی جڑیں کتاب پیدائش میں حضرت آدمؑ کے قصے سے وابستہ ہیں۔ پولس نے کہا کہ یسوع مسیح نے صلیب پر لٹک کر اس لعنت کو ختم کیا۔ انبیائے بنی اسرائیل اور حضرت مسیحؑ نے نہ تو ازلی گناہ کی لعنت کا ذکر کیا اور نہ ہی اسے انسانی نجات کے لیے ضروری قرار دیا۔[43]

عقیدہ کفارہ کا مقصد اور اس کی عوامی قبولیت

مسیح کو صلیب دینے کے واقعے نے ایک مذہبی تنازع کو جنم دیا، کیونکہ یہودی شریعت کے مطابق صلیب پر لٹکایا جانا لعنت کی علامت تھی۔[44] پولس نے اس واقعے کو یوں پیش کیا کہ یسوع نے انسانیت کی خاطر یہ لعنت اپنے اوپر لے لی۔[45] یہ عقیدہ ان لوگوں میں مقبول ہوا جو گناہوں کی بخشش کے لیے آسان راستہ تلاش کر رہے تھے۔

بپتسمہ اور عشائے ربانی

بپتسمہ اور عشائے ربانی وہ دو رسومات ہیں جن پر عیسائی فرقوں میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ بپتسمہ گناہوں سے پاکی کی علامت ہے، جبکہ عشائے ربانی مسیح کی قربانی کی یادگار ہے جو مسیح اور حواریوں کے آخری کھانے کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ یہ دونوں رسمیں عقیدہ کفارہ پر مبنی ہیں۔

عقیدہ کفارے کا تنقیدی جائزہ

عقیدہ کفارہ ایک بے ثبوت نظریہ ہے کیوں کہ یعقوب کے مطابق نجات کے لیے شریعت پر عمل ضروری ہے[46] اور خدا کسی کا طرفدار نہیں۔[47] اگر یسوع نے کفارہ ادا کر دیا، تو گناہ اور اس کی سزائیں جیسے عورت کا دردِ زچگی، محنت سے روزی کمانا، اور انسان و سانپ کی دشمنی کیوں جاری ہیں؟[48] اگر کفارہ خدا کی طرف سے نجات کا طریقہ تھا تو یہ پہلے نبیوں کے ذریعے کیوں واضح نہ ہوا؟ اور جو لوگ مسیح سے پہلے فوت ہوئے، ان کا کیا بنا؟[49] یہ عقیدہ ظالموں کو نجات کی یقین دہانی دیتا ہے، جبکہ مظلوموں کے حقوق کو نظرانداز کرتا ہے۔[50]

اناجیل کے مطابق مسیح نے خدا سے دعا کی کہ اگر ممکن ہو تو وہ اس قربانی سے بچ جائیں۔ اگر وہ خدائی منصوبے کے تحت تھے، تو ان کی یہ دعا اور پریشانی کیوں؟[51]

عقیدہ کفارہ کئی منطقی، اخلاقی اور مذہبی نیز یہ عقیدہ الٰہی انصاف، انسانی آزادی، اور گناہوں کے خاتمے کے دعوے پر پورا نہیں اترتا۔ بائبل خود کہتی ہے کہ ہر انسان اپنے گناہوں کا خود ذمہ دار ہے،[52] اور گناہوں کی معافی توبہ اور نیک اعمال کے ذریعے ممکن ہے۔[53]

موروثی گناہ

اسے ازلی گناہ بھی کہا جاتا ہے، مسیحی عقیدے کے مطابق انسانی فطرت میں ابتدا سے ہی موجود ہے۔ یہ گناہ آدم و حوا کے باغِ عدن میں ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کے باعث انسانیت میں داخل ہوا اور نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔[54] اس تصور کے مطابق، بدی انسانی دل و دماغ میں خیال اور تصور کی صورت میں موجود رہتی ہے۔[55]

پولس نے اس تصور کو نجات کے انتظام سے جوڑتے ہوئے کہا کہ جس طرح آدم کی نافرمانی سے گناہ دنیا میں آیا، اسی طرح یسوع مسیح کے ذریعے گناہ سے نجات ممکن ہوئی۔[56] تاہم، یعقوب کے مطابق گناہ انسان کی خواہشات سے جنم لیتا ہے؛ جب خواہشات شدت اختیار کرتی ہیں تو گناہ کو جنم دیتی ہیں، اور گناہ بڑھ کر موت کا سبب بنتا ہے۔[57]

موروثی گناہ کا تصور ہمیشہ کلیسیا میں خاص طور پر 354ء سے 430ء کے دوران بحث و اختلاف کا موضوع رہا ہے، سینٹ آگسٹائن نے اس عقیدے کی حمایت کی، جبکہ فلاغنیوس نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ انسان پیدائشی طور پر نیکی اور بدی سے پاک پیدا ہوتا ہے اور اس کے لیے یہ خود اختیار کرنے کا معاملہ ہے کہ وہ کون سی راہ چنے۔ فلاغنیوس کے مطابق بدی انسانی فطرت کا حصہ نہیں بلکہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ تحریکِ اصلاح کے دوران، مارٹن لوتھر اور دیگر رہنما دوبارہ سینٹ آگسٹائن کے نظریے کے حامی بن گئے۔[58] اس بحث کے لیے مختلف بائبلی حوالوں سے دلائل دیے گئے، جیسے:

"انسان کے دل کے خیالات بچپن سے ہی برے ہوتے ہیں۔[59] میں گناہ کی حالت میں اپنی ماں کے بطن میں پڑا۔[60] انسان پاک کیسے ہو سکتا ہے؟[61] جس طرح ایک آدمی کے ذریعے گناہ دنیا میں آیا، اسی طرح موت بھی سب میں پھیل گئی۔"[62]

مسیح اور موروثی گناہ

دلچسپ بات یہ ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے اپنی تعلیمات میں کہیں بھی موروثی گناہ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی باغِ عدن کے واقعے سے کوئی نتائج اخذ کیے۔ اگر یہ مسئلہ بنیادی ہوتا تو اس پر بحث مسیحؑ کے فوراً بعد شروع ہوتی، نہ کہ سینکڑوں سال بعد۔ موروثی گناہ کا تصور نہ صرف عقل کے خلاف ہے بلکہ بائبل کی کئی تعلیمات سے بھی متصادم ہے، جن میں کہا گیا کہ ہر شخص اپنے گناہ کا ذمہ دار ہوگا، بیٹا باپ کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔[63] جو جان گناہ کرتی ہے، وہی سزا پائے گی۔[64]

پولس نے یونانی فلسفے اور قدیم رسوم و رواج سے متاثر ہو کر یہ نظریہ وضع کیا۔ قدیم تہذیبوں میں ایک رسم تھی کہ کسی عظیم مصیبت کے وقت کسی عزیز کو قربان کر کے عوام کے گناہوں کی تلافی کی جاتی تھی۔[65] اس رسم کی جھلک بائبل میں بھی نظر آتی ہے، جیسے شاہِ موآب کا اپنے بیٹے کی قربانی دینا۔[66]

المختصر موروثی گناہ کا عقیدہ عقل و منطق اور بائبل کی حقیقی تعلیمات دونوں کے خلاف ہے۔ یہ عقیدہ ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتا ہے جو انسانوں کو ان کے گناہوں کے لیے خود ہی سزاوار بناتا ہے اور ان کی نجات کے لیے مزید آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر مسیحؑ گناہ سے نجات کا ذریعہ بنے تو دنیا میں گناہ کا سلسلہ آج بھی کیوں جاری ہے۔

عقیدہ ابنیت

لوقا کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح کو خدا کے بیٹے ہونے کا شعور ممکنہ طور پر پہلی بار اس وقت ہوا جب ان کی عمر تقریباً 12 سال تھی۔[67] ان کے بپتسمہ کے دوران پاک روح نے اس حقیقت کی تصدیق کی اور کہا، تو میرا بیٹا ہے۔[68] بعد میں، جب ان کے مقدمے کے دوران ان سے حلفیہ سوال کیا گیا کہ کیا وہ خدا کے بیٹے ہیں، تو انہوں نے واضح طور پر اثبات میں جواب دیا، ہاں، میں ہوں۔[69]

جب بھی یسوع نے اپنے بارے میں کہا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں، یہ بات ان کے خدا کے ساتھ ایک منفرد اور گہری قربت کو ظاہر کرتی ہے۔ اناجیل متوافقہ میں اس موضوع پر محدود معلومات ملتی ہیں، لیکن یوحنا کی انجیل میں اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یوحنا کے مطابق، یسوع خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں، اور ان کا باپ کے ساتھ کامل یگانگت اور شراکت کا ایسا لازوال تعلق ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ بطور بیٹا، وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے بلکہ وہی کرتے ہیں جو باپ نے انہیں دنیا میں بھیج کر سونپا ہے۔ یسوع کا کہنا تھا کہ وہ باپ کے نام میں آئے ہیں، اور ان کے اعمال و اقوال باپ کے حکم کے تابع ہیں۔ اسی لیے ان کی زندگی خدا کے مکمل اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ باپ مجھ سے بڑا ہے، تو یہ ان کی الوہیت کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ان کی بیٹے کی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے، جو ہمیشہ عاجزی اور خوشی سے بیٹے کا کردار نبھاتے ہیں۔ باپ نے بیٹے کو دو اہم ذمہ داریاں دی ہیں، دنیا کو زندگی دینا اور عدالت کرنا، تاکہ تمام لوگ بیٹے کی عزت کریں۔ اس کا مطلب ہے کہ باپ تمام انسانوں کو یسوع کو ویسے ہی تعظیم دینے کا حکم دیتا ہے جیسے وہ خدا باپ کو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے عہد نامے میں یسوع کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے، جو ان کی الوہیت کا ثبوت ہے۔ اس حوالے سے چند اہم اقتباسات نئے عہد نامے میں موجود ہیں، جو اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں:

یوحنا رسول خدا کے بیٹے یسوع مسیح کو خدا کا ازلی کلمہ قرار دیتا ہے[70]، جبکہ پولس انہیں مجسم ہونے کے بعد اور ان کے تجسم سے پہلے دونوں حالتوں میں ان دیکھے خدا کی صورت بیان کرتا ہے۔[71] عبرانیوں کے نام خط میں انہیں خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش کہا گیا ہے۔ جب خدا کا کلام مجسم ہوا تو نہ انہوں نے اپنی الوہیت کو ترک کیا، نہ اس میں کمی واقع ہوئی، اور نہ ہی وہ تجسم سے پہلے کے اپنے کاموں سے دست بردار ہوئے۔ بتایا گیا ہے کہ اس میں سب چیزیں قائم رہتی ہیں اور وہ اپنی قدرت کے کلام سے سب چیزوں کو سنبھالتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ زمین پر تھے، یہ کام جاری رہا۔ جب یسوع اس دنیا میں آئے، تو انہوں نے اپنی ظاہری جاہ و جلال کو ترک کر دیا اور عاجزی اختیار کرتے ہوئے غریب بن گئے۔[72] تاہم، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے تجسم سے ان کی الوہیت یا قدرت میں کوئی فرق آیا۔ پولس لکھتا ہے کہ الوہیت کی ساری معموری اس میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے۔[73] خدا کے بیٹے کا جسم ان کی الوہیت کو متاثر نہیں کرتا، بلکہ وہ انسانیت کو اپنا لیتے ہیں۔ جس طرح بعد میں پاک روح انسانوں میں سکونت کے لیے آیا، ویسے ہی بیٹے نے جسم میں سکونت اختیار نہیں کی بلکہ انہوں نے شخصی طور پر مکمل انسانی زندگی گزارنی شروع کی۔ یسوع مسیح نے انسانی جسم اور نفس کی تمام خوبیاں اپنائیں اور وہ انسانی جسمانی اور نفسی تجربات کا حصہ بنے۔ یوں یسوع مسیح مکمل انسان بن گئے، اور ان کی یہ انسانیت ابدی ہے۔ اگرچہ وہ اب آسمان پر ہیں، پھر بھی ان میں الٰہی اور انسانی دونوں فطرتیں قائم ہیں، اور یہ ہمیشہ یونہی قائم رہیں گی۔[74]

عقیدہ ابنیت کی ضرورت

پادری ایس ایف خیر اللہ لکھتے ہیں کہ انسان اپنی گناہ آلود فطرت کے باعث اس قابل نہیں کہ اپنے اعمال یا کسی اور ذریعے سے خدا تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس لیے ضروری تھا کہ خدا خود انسان کی طرف قدم بڑھائے۔ تاہم، خدا اپنی قدوسیت کے سبب گناہ گار انسان سے اس وقت تک میل جول نہیں کر سکتا جب تک گناہ دور نہ ہو جائے۔ گناہ کو ہٹانے کے لیے لازم تھا کہ خدا یا تو انسان کو اس کے گناہوں کی سزا دے، جو اس کی ہلاکت کا باعث بنتی، یا پھر خود کوئی ایسا انتظام کرے کہ گناہ کا بدلہ بھی چکایا جائے اور انسان کو نجات بھی ملے۔ یہ ممکن صرف فدیہ دینے کے ذریعے ہی تھا، یعنی خدا خود انسان کا فدیہ ادا کرے، اور یہی کچھ خدا نے کیا۔ چونکہ گناہ انسان سے سرزد ہوا تھا، اس لیے اس کا فدیہ بھی صرف ایک انسان ہی دے سکتا تھا۔ لیکن دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں تھا جو گناہ سے پاک ہو۔ ایک گناہ گار انسان دوسرے گناہ گار کے گناہوں کا فدیہ نہیں دے سکتا۔ یہاں خدا کے تجسم کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ایسا انسان آئے جو گناہ سے پاک ہو۔ خدا نے اس کا انتظام کیا اور وقت پورا ہونے پر اپنے بیٹے کو بھیجا، جو عورت سے پیدا ہوا اور شریعت کے ماتحت آیا تاکہ شریعت کے ماتحتوں کو آزاد کرے۔ خدا نے اپنے بیٹے کو جسم میں اس لیے بھیجا کہ ایک کامل انسان، گناہ گار انسان کے لیے فدیہ دے۔ یسوع مسیح کامل انسان اور کامل خدا ہیں۔ انہوں نے ایک انسان کی حیثیت سے انسان کے گناہوں کا کفارہ دیا تاکہ گناہ گار انسان خدا کے حضور راستباز ٹھہر سکے۔ جیسا کہ کلام میں لکھا ہے، اسی کو اس نے ہمارے واسطے گناہ ٹھہرایا تاکہ ہم اس میں ہو کر خدا کے راستباز ہو جائیں۔ یوں، یسوع مسیح کے ذریعے شریعت کا تقاضا پورا ہوا اور انسان کے لیے نجات کا دروازہ کھل گیا۔[75]

عقیدہ ابنیت کا ارتقاء

مسیح کے ابتدائی پیروکاروں کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ حضرت یسوع خدا کے بیٹے ہیں۔ وہ آپ کو آنے والی آسمانی بادشاہت کے روحانی حکمران کے طور پر تسلیم کرتے تھے اور اس امید میں تھے کہ آپ کے ظہورِ ثانی کے بعد دنیا کا نظام بدل جائے گا۔ ان کے عقیدے کے مطابق، یسوع دنیوی طاقتوں کے ظلم و ستم کا خاتمہ کریں گے، اور انسانیت عالمگیر اخوت اور عدل و انصاف کے عہد میں داخل ہو گی۔ تاہم، وقت کے ساتھ مسیح کے پیروکاروں کی یہ امید مایوسی میں بدلنے لگی۔ اس کے نتیجے میں عیسائیوں کا عمومی رجحان اس طرف مائل ہو گیا کہ یسوع نے اپنی موت کے ذریعے انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے اس کی روحانی نجات کا راستہ ہموار کیا۔ یوں، مسیح کو انسانیت کے نجات دہندہ کے طور پر تسلیم کرنے کا تصور مضبوط ہوتا گیا۔ ان کے ماننے والوں کا یقین بن گیا کہ یسوع کو قبول کرنے کے بعد انسان گناہ کی آلائشوں سے پاک ہو کر آسمانی بادشاہت میں داخل ہو سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں خدا اور انسان کے تعلق کے بارے میں سب سے زیادہ زور خدا کی ابویت پر دیا گیا۔ ان کے مطابق،

خدا انسان کے لیے ویسا ہی ہے جیسا ایک باپ اپنی اولاد کے لیے ہوتا ہے۔ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، اسی طرح خدا بھی انسان کی تکالیف اور مصائب میں اس کا ہمدرد اور مددگار ہے۔ یہ تعلیم اس بات کو واضح نہیں کرتی کہ انسان جسمانی طور پر خدا کی اولاد ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرے اور یہ یقین رکھے کہ نیکی اور اخلاق کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات میں وہ خدا سے مدد اور نصرت کی امید رکھ سکتا ہے۔

یہودیوں میں عمومی طور پر خدا کا تصور ایسا تھا کہ خدا کو انسان سے مکمل طور پر جدا اور ماوراء سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اس تصور کو تبدیل کرنے کے لیے اور خدا اور انسان کے تعلق کو زیادہ گہرا اور قریب تر بنانے کے لیے خدا کے لیے آسمانی باپ کی اصطلاح استعمال کی۔ تاہم، مسیح کی غیر معمولی شخصیت، نجات دہندہ کے طور پر ان کی آمد کی امید، اور پھر یہودیوں کی جانب سے ان کے ساتھ کیے گئے ظالمانہ سلوک کا ردعمل، یہ تمام عناصر مل کر اس خیال کو تقویت دیتے گئے کہ مسیح عام انسانوں کے مقابلے میں خدا کے ساتھ ایک خاص اور منفرد تعلق رکھتے تھے۔ جب تک مسیحیت فلسطین تک محدود رہی، اس وقت تک مسیح اور خدا کے تعلق کے حوالے سے کوئی ایسا تصور پیدا ہونا مشکل تھا جو یہودی عقائد کے خلاف ہو۔ اس لیے، عیسیٰ کو خدا کا برگزیدہ اور محبوب تسلیم کرنے کے باوجود، فلسطینی یہودی مسیحی، مسیح کو ابن اللہ ماننے کی طرف مائل نہ ہو سکے۔ لیکن جب مسیحیت کی تبلیغ ان علاقوں میں شروع ہوئی جہاں بت پرستی اور مشرکانہ عقائد عام تھے یا جہاں یونانی مذہبی تصورات کا غلبہ تھا، تو آسمانی باپ کے تصور میں تبدیلی آنے لگی۔ مسیح کی مظلومانہ موت کے تصور کے ساتھ مل کر یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ مسیح کا خدا سے تعلق عام انسانوں سے مختلف اور منفرد تھا، اور وہ حقیقتاً خدا کے بیٹے تھے، جنہیں خدا نے انسانیت کی نجات کے لیے دنیا میں بھیجا تھا۔ یونانی اور رومی تہذیب میں ایسے خیالات عام تھے کہ دیوتا برگزیدہ انسانوں کے جسم میں حلول کر سکتے ہیں۔ اس ذہنی فضا میں یہ عقیدہ پھیلانا مشکل نہ تھا کہ مسیح نے آسمانی باپ کا جو تصور پیش کیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ مسیح خدا کا بیٹا تھے، اور ان کی ذات میں خود خدا مجسم ہو کر انسانیت کی نجات کے لیے دنیا میں آیا تھا۔

جیسا کہ بیان ہوا، اس تصور کو یونانی افکار اور یہودی مذہبی خیالات نے مزید تقویت بخشی۔ یہودیوں کے ہاں ایک ماوراء خدا کا تصور موجود تھا، جو کائنات اور انسانی تمناؤں سے بالکل الگ اور بے تعلق تھا۔ انسان کا کام صرف یہ تھا کہ وہ اس خدا کے احکام کی پیروی کرے۔ مسیحیت کے ظہور سے کچھ عرصہ قبل، کئی مفکرین اس بات کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھے کہ کائنات اور انسان کے لیے خدا کی اس بے تعلقی کو کیسے ختم کیا جائے۔ وہ ایک ایسے واسطے کی تلاش میں تھے جو خدا اور انسان کے تعلق کو جوڑ سکے۔ اسی قسم کے واسطے کا تصور ایک یہودی مفکر فائلو (Philo) نے بھی پیش کیا، جو اسکندریہ میں یہودیوں کی مقدس کتب کی فلسفیانہ تشریح میں مشغول تھا۔ فائلو نے روایتی مکتب فکر کے کلمہ (Logos) کو خدا اور انسان کے درمیان رابطے کا ذریعہ قرار دیا۔ ابتدا میں کلمہ کو خدا کی صفت سمجھا جاتا تھا، لیکن فائلو نے اسے ایک مستقل اور خود مختار ہستی کے طور پر پیش کیا۔ فائلو کا نظریہ تھا کہ خدا نے کائنات کو براہ راست تخلیق نہیں کیا، بلکہ پہلے کلمہ کو پیدا کیا اور پھر اس کے ذریعے کائنات کو وجود بخشا۔ اس طرح، کلمہ گویا ایک خدائے ثانی یا خدا کے نمائندے کے طور پر سامنے آیا۔

یونانیوں کا خدا کے بارے میں تصور بھی ایک ماورائی تصور تھا۔ ان کے نزدیک خدا اتنا مکمل اور بے عیب تھا کہ اسے اس ناقص اور عیب دار دنیا سے کوئی دلچسپی لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس تصور نے انسان اور خدا کے درمیان ایک وسیع فاصلہ اور دوری پیدا کر دی تھی۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ ایسے خدا کے تصور سے اطمینان اور سکون حاصل نہیں کر سکتی، جسے اس کی تمناؤں اور آرزوؤں سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ اس لیے یونانی افکار کے زیرِ اثر عوام کسی ایسے خدا کے خواہاں تھے جو ان کے دکھ، درد، اور خوشیوں میں شریک ہو سکے۔ یہودیوں کے ہاں خدا کا جو تصور موجود تھا، وہ یونانیوں کی اس خواہش کے زیادہ قریب تھا، لیکن یہودیوں نے اپنے خدا کو صرف اپنی قوم کے لیے محدود کر لیا تھا۔ مسیحیت نے خدا کا جو تصور پیش کیا، اس میں یہودی عقیدے کے عناصر بھی شامل تھے، مگر وہ خدا کو انسانوں کے قریب تر بھی لے آئی۔ جب حضرت مسیح کو انسانیت کا نجات دہندہ اور خدا کا بیٹا قرار دیا گیا، تو یہ خدا اور انسان کے درمیان وہ واسطہ بن گیا جس کی کمی یونانیوں اور رومیوں کو شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس عقیدے کے وجود میں آنے سے پہلے، یونانیوں اور رومیوں نے اپنے بادشاہوں کو الوہیت کا درجہ دے کر اپنی

اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب مسیحیت نے یونانی اور رومی دنیا میں اپنا پیغام پہنچایا، تو مسیح کے تصور میں معمولی سی تبدیلی نے الوہیت مسیح اور یسوع کے ابنِ اللہ ہونے کے عقیدے کو جنم دیا۔ یونانی اور رومی تہذیبی و علمی برتری کے اثرات کے تحت، آہستہ آہستہ ان عیسائی پیروکاروں کے عقائد ختم ہوتے گئے، جو حضرت مسیح کو صرف مسیحا اور آسمانی بادشاہت کے حکمران کے طور پر مانتے تھے۔[76]

عقیدہ ابنیت کا تنقیدی جائزہ

بائبل کے ان تمام اقوال کو لفظی یا لغوی معنوں میں لینا مناسب نہیں ہوگا، کیونکہ یہ دراصل تمثیلی اور اشارتی زبان میں بیان کیے گئے ہیں، جن کے کئی معنی اور وضاحتیں ممکن ہیں۔ بائبل میں متعدد مقامات پر انبیاء اور اہلِ حق کو خداوند کا بیٹا کہا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"فرعون سے کہو کہ خداوند نے فرمایا، اسرائیل میرا پہلوٹھا بیٹا ہے"[77]

"تم اپنے خدا کے فرزند ہو"[78]

"خدا اپنے پاک گھر میں بیواؤں کی دادرسی کرنے والا اور یتیموں کا باپ ہے"[79]

"اور میں اس کی بادشاہت کو ہمیشہ کے لیے قائم کروں گا کہ وہ میرے نام کا ایک گھر بنائے گا، وہ میرا بیٹا ہوگا اور میں اس کا باپ۔"[80]

"صلح کروانے والے مبارک ہیں کیونکہ وہ بیٹے کہلائیں گے خدا کے"[81]

"میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ محبت رکھو اپنے دشمن سے اور دعا کرو اپنے ستانے والوں کیلئے کہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے ٹھہرو"[82]

"اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے"[83]

"اور وہ آدم کا اور وہ خدا کا بیٹا تھا"[84]

"اس لئے کہ خدا کی روح کی ہدایت پر چلنے والے خدا کے بیٹے ہیں۔"[85]

ان حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ بائبل میں خدا کے بیٹے کا تصور جسمانی یا حقیقی معنوں کے بجائے محبت، قربت، اور پسندیدگی کی تمثیل ہے۔ یہی اصطلاح حضرت عیسیٰ کے لیے بھی ان کی خدا کے محبوب پیغمبر ہونے کے سبب استعمال ہوئی۔ حضرت عیسیٰ نے خود اس اصطلاح کو خدا کے پسندیدہ اور نیک بندوں کے لیے استعمال کیا تھا۔[86]

یہ حوالہ جات ثابت کرتے ہیں کہ خدا کے بیٹے کے الفاظ کو حقیقی یا جسمانی معنوں میں لینا بائبل کی اصل روح کے مطابق نہیں ہے۔ یہ الفاظ اشارتی اور تمثیلی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں، جو خدا اور انسان کے گہرے تعلق کو بیان کرتے ہیں، نہ کہ کسی جسمانی یا لغوی مفہوم کو۔

اب ہم یسوع مسیح کی الوہیت کے عقیدے کا جائزہ لیتے ہیں، جس پر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقے متفق ہیں۔ ان کے مطابق، یسوع مسیح ازل سے خدا تھے، انسانی شکل میں دنیا میں آئے، اور کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ تاہم، حضرت یسوع مسیح کے اپنے فرمودات اس عقیدے کی تائید نہیں کرتے بلکہ وہ اس تصور کی واضح طور پر تردید کرتے ہیں۔ ان کے اقوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو خدا کے بجائے ایک نبی اور پیغمبر کے طور پر پیش کرتے تھے:

"تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے؟ ایک خدا کے علاوہ کوئی نیک نہیں"[87]

انجیل مقدس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب انہیں مصلوب کیا گیا تو انہوں نے پکار کر کہا:

"الوہی الوہی لما شبقتني" "الاھی الاھی لما شبقتنی"[88]

"اے میرے خدا تونے کیوں مجھے چھوڑ دیا۔"

کیا خدا ایسے الفاظ ادا کر سکتا ہے؟ یہ تو واضح طور پر ایک انسان کے الفاظ ہیں، جو خدا سے مدد کی التجا کر رہا ہے۔ چنانچہ، یسوع مسیح نے ہمیشہ خود کو ایک

نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا اور اس کے علاوہ اپنے بارے میں کوئی اور دعویٰ نہیں کیا۔ باقی تمام باتیں مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں۔ انہیں انسانوں کی رہنمائی کے لیے نبوت کے ساتھ ایک کتاب عطا کی گئی، اور ان کے اقوال اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں۔

"جو کوئی میرے نام پر ایسے بچوں میں سے ایک کو قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے اور جو کوئی مجھے قبول کرتا ہے وہ مجھے نہیں بلکہ اسے جس نے مجھے بھیجا ہے قبول کرتا ہے"[89]

"اگر تم میرے حکموں پر عمل کروگے تو میری محبت میں قائم رہوگے جیسے میں نے اپنے باپ کے حکموں پر عمل کیا ہے اور اس کی محبت میں قائم ہوں"[90]

"جو تم کو قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ مجھے اور بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے"[91] "میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اس نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ کیا کہوں اور کیا بولوں۔"[92]

دعا اور التجا انسان کی فطری ضرورت ہے، جبکہ اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کیونکہ وہ غنی ہے اور بے نیاز ذات ہے۔ حضرت یسوع مسیح کی دعائیں ملاحظہ کریں:

"مگر وہ جنگلوں میں الگ جا کر دعا کیا کرتا تھا۔"[93]

"وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو کر اور بھی دل سوزی سے دعا کرنے لگا۔"[94]

"اس وقت یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک میں وہاں جا کر دعا کروں"[95]

خدا کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ قادر مطلق ہے جیسا کہ انجیل میں مذکور ہے:

"اور میں تمہارا باپ ہوں گا اور تم میرے بیٹے بیٹیاں ہوں گے یہ خداوند قادر مطلق کا قول ہے۔"[96]

حضرت یسوع مسیح میں قادرِ مطلق ہونے کی صفت موجود نہیں تھی۔ انجیل کے درج ذیل حوالوں سے ان کی الوہیت اور قادرِ مطلق ہونے کی نفی ثابت ہوتی ہے:

"میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کر سکتا جب سنتا ہوں عدالت کرتا ہوں اور میری عدالت درست ہے کیونکہ میں اپنی مرضی نہیں اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہوں۔"[97]

"اور وہ کوئی معجزہ وہاں نہ دکھا سکا صرف تھوڑے سے بیماروں پر ہاتھ رکھ کر انہیں اچھا کر دیا"[98]

"ہیرودیس یسوع کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ وہ مدت سے اسے دیکھنے کا مشتاق تھا اس لئے کہ اس کا حال سنا تھا اور اس کا کوئی معجزہ دیکھنے کا امیدوار تھا اور وہ اس سے بہتیری باتیں پوچھتا رہا مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا"[99]

خدا تعالیٰ علیم و خبیر ہے، اسے ہر چیز کا علم ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں، اور وہ دلوں کے تمام رازوں کو جانتا ہے:

"فقط تو ہی سب بنی آدم کے دلوں کو جانتا ہے"[100]

لیکن حضرت عیسی میں ایسی کوئی صفات نہیں تھی۔ انجیل میں ہے کہ:

"میں آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا"[101]

"اور جب صبح کو پھر شہر کو جا رہا تھا اسے بھوک لگی اور راہ کے کنارے انجیر کا ایک درخت دیکھ کر اس کے پاس گیا اور پتوں کے سوا کچھ نہ پا کر اس سے کہا کہ آئندہ تجھ میں کبھی پھل نہ لگے گا اور انجیر کا درخت اسی دم سوکھ گیا"[102]

"اس کے پیچھے آ کر اس کی پوشاک کا کونہ چھوا اور اسی دم اس کا خون بہنا بند ہو گیا اس پر یسوع نے کہا اے کون ہے جس

نے مجھے چھوا جب سب انکار کرنے لگے تو پطرس اور اس کے ساتھیوں نے کہا اے صاحب لوگ تجھے دباتے اور تجھ پر گر پڑتے ہیں "[103]

"اس نے پھر کر پطرس سے کہاں اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے۔"[104]

اناجیل کے درج بالا حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ الوہیتِ مسیح کا عقیدہ درست نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ ایک انسان اور خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ وہ خدائی درجے پر فائز نہیں تھے اور نہ ہی ان میں خدائی صفات موجود تھیں۔ وہ انسانی صفات کے حامل تھے، دعا اور التجا کرتے تھے، اور خدا سے مدد طلب کرتے تھے۔ وہ خدا کی طرح علیم و خبیر نہ تھے، کیونکہ خدا ازلی و ابدی ہے اور ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کو انسان کی طرح موت آئی، اور اناجیل کی عبارتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ غرض، خدا کی ذات منفرد اور بلند ہے، اور حضرت یسوع مسیح خدا نہیں تھے بلکہ ایک انسان اور خدا کے عظیم پیغمبر تھے۔

مصادر و مراجع:

---

[1] اعمال 22:28
[2] فلپیوں 3:5
[3] اعمال 22:22-29
[4] ایضاً: 3
[5] ایضاً 7:58
[6] ایضاً 8:1
[7] ایضاً: 3
[8] ایضاً 9:22-1
[9] ایضاً: 15
[10] ایضاً: 16
[11] ایضاً: 17
[12] ایضاً: 18
[13] ایضاً: 20
[14] ایضاً: 21
[15] ایضاً: 22
[16] گلتیوں 1:17
[17] اعمال 9:24-25
[18] گلتیوں 1:18
[19] اعمال 9:26-28
[20] ایضاً 11:25
[21] ایضاً: 19-21
[22] ایضاً 13:9
[23] 2۔ کرنتھیوں 11:24-27
[24] McRay, John, Paul: His Life and Teaching. Grand Rapids, Baker Academic, LA, 2007, P.266
[25] عبد الرحمن، البرہان، حقوق الناس ویلفئیر فاؤنڈیشن، لاہور، 2019ء، ص 508

[26] خیر اللہ، ایف ایس، قاموس الکتاب، مسیحی اشاعت خانہ، لاہور، 1997ء، ص1029
[27] Encyclopedia Americana, Grolier Academic Reference, UK, 1958, Vol.2, P.514
[28] خیر اللہ، ایف ایس، قاموس الکتاب، ص791
[29] ایضاً، ص792
[30] خیر اللہ، ایف ایس، قاموس الکتاب، ص691
[31] رومیوں5:19؛ 1۔کرنتھیوں15:3-4؛ 1۔تیمیتھیس2:6؛ رومیوں3:25؛ 4:14-15؛ 5:13؛ عبرانیوں9:12-14؛ گلتیوں2:21؛ افسیوں2:15؛ عبرانیوں7:12؛ 8:13
[32] لوقا15:7، 10
[33] ایضاً:11-32
[34] ایضاً17:10
[35] یوحنا14:21
[36] متی19:17
[37] Adolf von Harnack, What is Christianity? Martino Fine Books, London, 2011, P.129
[38] اعمال26:19-21
[39] یعقوب2:10، 20-21
[40] اعمال21:17-26
[41] The Encyclopedia Bartanica, Encyclopædia Britannica, Inc. NY, 1910, Vol.5, P.634
[42] The New Catholic Encyclopedia, Gale Research Inc, Gale, 2002, Vol.1, P1025
[43] Muller, Herbert J. The Uses of the Past: Profiles of Former Societies, New American Library, NY, 1952, P.160
[44] استثناء21:23
[45] گلتیوں3:13
[46] یعقوب2:10
[47] اعمال10:34-35
[48] پیدائش3:13-19
[49] عاموس3:7
[50] James Hastings, The Encyclopaedia of Religion and Ethics, Bloomsbury T&T Clark, NY, 2000, Vol.5, P.644
[51] لوقا22:44؛ متی26:36-40؛ متی27:26؛ مرقس14:33
[52] استثناء24:16؛ حزقی ایل18:20
[53] حزقی ایل18:21-22
[54] پیدائش8:21؛ 1۔سلاطین8:46؛ زبور51:5؛ ایوب15:14؛ 25:4
[55] ایضاً6:5
[56] رومیوں5:12-21
[57] یعقوب1:13-14
[58] خیر اللہ، ایف ایس، قاموس الکتاب، ص791-792
[59] پیدائش8:21
[60] زبور51:5
[61] ایضاً25:4
[62] رومیوں5:12-13
[63] استثناء24:16
[64] حزقی ایل18:20
[65] Frazer, James George, The dying God (The Golden Bough), Macmillan Co. NY, 1911, Vol.3, P.166
[66] 2-سلاطین3:27
[67] لوقا2:49

[68]مرقس11:1
[69]ایضاً62:14
[70]یوحنا49:1
[71]کرنتھیوں4:4
[72]کرنتھیوں9:8
[73]گلتیوں9:2
[74]خیر اللہ، قاموس الکتاب، ص236-237
[75]ایضاً، ص231
[76]محمد مظہر الدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1986ء، ص121-124
[77]خروج22:4
[78]استثناء1:14
[79]زبور5:68
[80]2۔سموئیل7:13-23؛1۔تواریخ22:9-11
[81]متی9:5
[82]ایضاً:44-45
[83]ایضاً9:23
[84]لوقا38:3
[85]رومیوں34:8
[86]متی5:44-45؛متی9:5
[87]مرقس18:10
[88]ایضاً:34
[89]مرقس37:9
[90]یوحنا10:15
[91]متی40:10
[92]یوحنا49:21
[93]لوقا16:5
[94]ایضاً44:22
[95]متی38:28
[96]کرنتھیوں18:6
[97]یوحنا30:5
[98]مرقس5:6
[99]لوقا23:8-9
[100]1۔سلاطین39:8
[101]متی19:16
[102]ایضاً21:18-19
[103]لوقا8:44-45
[104]متی24:16